مارکس کی معاشرتی اور معاشی جدلیات اور علامہ اقبال

Social and Economic Dialectics of Marx and Allama Iqbal

Asia Mir

PhD Scholar, Department of Urdu, Alhamd Islamic University Islamabad.

Dr. Sher Ali

Chairman Department of Urdu, Alhamd Islamic University.

ABSTRACT:

Since the majority of philosophers base their theories on the idea of human well being, human sciences did not envision an ideal state but rather a setting where concrete and useful services to human well-being were provided. Your fate is determined by God, but statistics and formulas in human scientific, social, and particularly economic fields have demonstrated how the early members of humankind appropriated human resources and exploited people like commodities. This system has continually been created in this alluring manner of government. Mother's data shows that the current economic system will inevitably fail. It doesn't matter why this system failed if it was so instinctive. Iqbal's view in this regard holds that military prowess and ultimately suffers from here. We cannot dispute its scientific supremacy notwithstanding this shortcoming.

Keywords: *Idealism, Social dynamic, Polygyny, Polygandry, Dialectical materialism,*

انسانی فلاح و بہبود چونکہ مفکروں کی بنیادی تعلیم ہے۔ لہٰذا زیادہ تر مفکروں نے عموماً انسانی بھلائی کے لیے نظریات پیش کیے۔ اس ضمن میں کارل مارکس کی خدمات مختلف اس لیے ہیں کیونکہ اس نے نظامات ہائے فکر کی تمام اکائیوں کو یکسر اُلٹ کر رکھ دیا۔ مارکس نے کسی خیالی ریاست کا خیال پیش نہیں کیا بلکہ ایک ایسی ریاست کا خاکہ تیار کیا جس میں انسانی بہتری کے ٹھوس اور قابلِ عمل اقدامات پیش کیے گئے۔ صرف انسانی استحصال کی گردان نہ سنائی اور نہ ہی استحصال زدہ انسانوں کو یہ تلقین کی کہ یہی تمہارا مقدر اور تقسیمِ خدا ہے۔ بلکہ تاریخی، سائنسی، معاشرتی اور خصوصاً معاشی اعداد و شمار اور فارمولے سے یہ ثابت کیا کہ نوعِ انسانی میں انداز جہاں بانی کی بنیاد رکھنے والوں نے کس طرح وسائل پر قابض ہو کر انسانوں کو اجناس کی طرح برتا۔ حکمرانی کے اس پُرکشش انداز نے اس کو مسلسل بنا دیا۔ مارکس

اعداد و شمار کے ذریعے ثابت کرتا ہے کہ موجودہ نظامِ سرمایہ داری کو منہدم ہونا ہی ہے۔ اس انہدام کے بعد پرولتاری حکومت ہی انسانوں کی درست بھلائی کے اقدامات کر سکتی ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ اگر یہ نظام اتنا ہی فطری تھا تو ناکام کیوں ہوا؟ اس ضمن میں اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ ہر شتر بے مہار بالآخر بربادی سے دوچار ہوتا ہے۔ اس ناکامی کے باوجود مارکس کی علمی برتری سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کے لیے باعثِ خیر ہو۔ اسی مقصد کے لیے رب رحیم نے انسانی ہدایت کا سلسلہ روز ازل سے جاری رکھا ہے۔ اسی طرح تمام عالمین اور مفکرین چاہے ہو کسی بھی مذہب و خطہ سے تعلق رکھتے ہوں وہ سب سے پہلے انسانی بھلائی کا درس دیتے ہیں۔ انسانی بھلائی کے پیشِ نظر بے شمار مفکروں نے فلاح انسانی کا درس دیا۔ جس میں انبیاء سے لے کر مفکرین بھی شامل ہیں۔ جیسے کانٹ ہیگل، آگسٹس، نطشے اور کارل مارکس اور دیگر شامل ہیں۔

سابقہ بلکہ موجودہ معاشروں میں بھی انسانی فلاح کی بلند ترین معراج ریاست ہی ہے اور اس ریاست کی طرح انسانی استعمار نے بھی ہر زمانے میں وسائل کو اپنے زیر نگیں رکھنے کی کوشش کی ہے۔

17 ویں صدی میں فرانس ایک خون آلودہ انقلاب سے آلودہ تھا۔ روسوؔ اور والٹیرؔ کے نظریات نے سوئی ہوئی بھیڑوں کو بھیڑیے بنا دیا تھا۔ ان مفکرین نے ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینک کر ہلچل پیدا کی جس کو بھنور بنانے میں کانٹؔ کے تخیل کا بڑا ہاتھ ہے۔ کانٹؔ کے افکار میں خوبصورت اضافہ ہیگلؔ کی "جدلیات" کرتی ہیں۔ مگر حالات کی ستم ظریفی ہیگل کو 'عنیت پرستی' Idealism کے طلسم سے باہر نکلنے ہیں نہیں دیتی۔ تاہم ان مفکرین نے بلندی افکار کے لیے کافی کچھ راستہ ہموار کر دیا تھا۔ انقلابِ فرانس، پڑوسی جرمنی کو مسلسل متاثر کر رہا تھا۔ جس پر کاری وار ہائنےؔ کی شاعری کر رہی تھی۔ ایسے ساز گار وقت میں مارکسؔ اور اینجلزؔ کی پیدائش ایک فطری عمل تھا۔

ان مفکرین نے صدیوں سے "رائج جامد قوانین" کو نہ صرف نظریاتی دلائل سے رد کیا بلکہ مارکسؔ نے تو عملی اور قانونی طور پر اس کے خلاف زندگی بھی جنگ کی۔ ان تمام مفکرین کی فکر کا بنیادی نکتہ 'عام انسان' ہے۔ ہر اُس عام انسان کو 'فلسطی' بھی کہہ سکتے ہیں جو زندگی سے بے حد "مطمئن" ہے۔ یہ وہ عام انسان ہے جو گردو پیش کی صعوبتوں اور اذیتوں سے جنونی عقیدت رکھتا ہے۔ اس عام انسان کے پیروں میں صدیوں کی غلامی و عقائد کی بیڑیاں ہیں اور وہ ان بیڑیوں سے بھی محبت رکھتا ہے۔ عام انسان چونکہ 'مثالیت پسند' ہے سو مثالی بننے اور بنانے کی دھن میں پورے اخلاص سے ان بات پر یقین رکھتا ہے کہ "دنیا ڈنڈے سے چلتی ہے"۔ ڈنڈا اور قانون، ریاستی اور مذہبی امور میں ہم معنی استعمال ہوتے ہیں۔

اس ڈنڈے کی چاہت میں چُور چُور یہ عام انسان پارسائی اور اخلاقیات کا مبلغ ہے۔ جب ریاست کی قوتِ قاہرہ خاطر خواہ کارہائے نمایاں انجام دینے کے لائق نہ رہے تو پھر پنڈت، پروہت نما سیاسی مُلّا حکومت کے لیے ایسے نظریات عوام میں رائج کرتے ہیں جن کی بدولت لوگوں کے دل و دماغ ریاست کے قوانین کے پابند ہو جائیں اور اطاعت و فرمانبرداری ان کی سرشت بن جائے۔

چنانچہ جب عام انسان کو آئین و رعایات اور عزت دینے کی کوشش کی جائے تو وہ "لبرل ازم" کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ خود بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ ابُو جہل نے کہا: "کیا ہم بتوں کو پوجنا چھوڑ دیں جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں؟" اس طرزِ فکر کو کتنے خوبصورت انداز میں ہنز خ ہائنے اپنی نظم میں لکھتا ہے:

" منچوؤں کے اشرافیہ نے مطالبہ کیا ہے کہ انقلاب کی موجودگی میں نجات کے موقع پر ہمیں محض تلوؤں پر بید مارنے کی سزا چاہیے"۔

ایسے افکار کو رد کر کے انسانیت کی سربلندی کا درس دینا کچھ سہل نہیں تھا۔ 200 سال پہلے "بنیادی انسانی حقوق" کی بات ہی ناممکن تھی۔ بلاشبہ انسانیت کو ایسے افکار سے نجات دلا کر مشرف بہ عظمت کرنے کا سہرا اس عظیم سائنسی قانون کی دریافت کے سر ہے جس نے آئیڈیلزم کے بت کو توڑ کر "تاریخی و مادی جدلیات" سے ثابت کی کہ "چند طاقتوروں" نے اپنی بقائے باہمی کے لیے کس عیاری سے کام لے کر غلامانہ افکار کی پرورش کی۔ دراصل "مادہ" سب سے بڑی طاقت ہے جس کو محدود کرنے کی کوشش ہر دور میں کی گئی اور ہر دور میں اس کا ردِ عمل آتا رہا۔ اس جدو جہد کو احاطۂ پیمائش میں لا کر بیانیہ شکل دینے والا انسان دراصل مارکس ہی ہے جو کہتا ہے:

" Relative criticism was faced with relative limits. Absolute criticism is faced with the absolute limits, the limits of the mass, the mass as limit. Relative criticism in its opposition, to definite limits was necessary it-self a limited individual."[1]

کارل مارکس نے سماجی حرکیات کی تاریخ میں ہیگل کے فرضیے کا اضدادی نظریہ پیش کر کے ایک نیا نظریہ متعارف کروایا جس نے بہر حال انسانی سماجی تاریخ اور حال کو بے حد متاثر کیا۔ مارکس "مادہ" "Material" کو اولین اہمیت دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ "مادہ" اولین و بنیادی طور پر موجود ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ باقی سب کچھ ثانوی ہے یا پھر مادہ کی تبدیلی اور حرکت کا نتیجہ ہے۔ اس حرکت اور تبدیلی کو آج کل سماجی حرکیات یا Social

[1]Trotsky, in Defence of Marxism, Reason of Revolt, p. 66

dynamics کہتے ہیں۔ مادہ کی حرکت پذیری اور تبدیلی سے دنیا وجود میں آئی، انسان کے رہنے کے لائق ہوئی۔ پھر جاندار پیدا ہوئے حتیٰ کی انسان کا ظہور ہوا۔ اوّلین انسان ترقی کرتے کرتے جب غاروں سے نکل کر اور شکار سے بڑھ کر زراعت کرنے کے قابل ہوا تو یہ 'مادہ' ہی کی ترقی ہے۔ مارکس ازم کے علاوہ دیگر سائنسی علوم بھی "دماغ" کو مادہ کی اعلیٰ ترین شکل قرار دیتے ہیں۔

مارکس کہتا ہے کہ "مادہ رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے اتنے نفیس مقام پر پہنچ گیا کہ "دماغ" کی شکل اختیار کی ۔ "وہ کہتا ہے "دماغ، مادے کی انسان کے خلاف منظّم سازش ہے" اسی دماغ کو کام میں کام میں لا کر غاروں میں رہنے والے آدم خوروں نے آدم کو کھانے کی بجائے اس کا استعمال کر کے طاقتور اور دولتمند ہونا سیکھا۔ جب آزاد و غیر طبقاتی معاشرہ نے غلام داری سماج کی شکل اختیار کر لی تو اسی 'مادہ' کی منظّم شکل نے اپنی جمع پونجی کو آگے منتقل کرنے کا انتظام کیا۔ عورت پر پہرہ لگایا تا کہ اس کی اولاد کی شناخت ہو سکے۔ پدر سری نظام رائج کیا گیا۔ گھریلو سطح سے شروع ہونے والا یہ سرمایہ دارانہ جاگیر دارانہ نظام بالآخر ایک ایسی شکل پر منتج ہوا جو تاریخ کا طاقتور ترین نظام تھا۔ جہاں ہر جاندار ایک جنس تھا۔ انسان سے لے کر محنت تک ہر چیز بکتی اور خریدی جاتی تھی۔ اس روش نے انسان کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا بورژوا اور پرولتاری۔ رفتہ رفتہ یہ نظام جاگیر داری شکل میں مستحکم ہوا۔ جب اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی تو منظّم مادّے یعنی دماغ نے اس کی شکل بدل کر اس کو صنعت کا نام دیا۔ جو سرمایہ دارانہ نظام کہلایا۔ بعد ازاں اس کی شکل بدل کر جمہوریت اور آمریت وغیرہ کو متعارف کروایا گیا۔ مارکس کی تعلیمات یہ ہیں کہ یہ روش غلط ہے کہ ہزارہا بھوکے ننگے اور کمزور مل کر ایک تنومند سرمایہ داری کی تجوری کو بھریں۔ جب اس کائنات میں مہیا کردہ وسائل مساوی ہیں تو اس سے استفادہ کرنے کا حق بھی سب کو برابر ملنا چاہیے۔ دستیاب جنس ہر ایک کی پہنچ میں ہونا چاہیے۔

دوسری اہم بات یہ کہ مادّہ ہو یا نظام اس کی ایک عمر ہوتی ہے اور اپنے عروج پر پہنچنے کے بعد اس کا زوال ایک لازمی امر بن جاتا ہے۔ چونکہ سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام اپنے عروج کو پہنچ کر اپنی عمر پوری کر چکا ہے اس کا انہدام لازم ہے۔ اس کے انہدام کے بعد اگر کوئی نظام اس دنیا کو چلا سکتا ہے تو وہ مارکسزم ہے۔ جہاں محنت کار اور سرمایہ دار کو برابر عوضانہ ملے۔ سب کی سماجی حیثیت برابر ہو اور فیصلے اصول پر مبنی ہوں۔ مارکس سے پہلے ہیگل اور اس کے پیروکار "یوٹوپیا" کا نعرہ لگاتے تھے۔ جب کہ مارکس نے معاشی اور اقتصادی اصولوں کو عالمگیر سطح پر منطبق کر کے ایک حقیقی نظام پیش کیا اور اس نظام کے پیش کرنے کے ساتھ ہی اس کی تباہی اور ناکامی کا راز بھی بتایا۔

جدلیات کیا ہے (What is Dialectics)

مارکس کی معاشرتی اور معاشی جدلیات اور علامہ اقبال

جدلیات کی نہایت سادہ تعریف اینجلز نے یوں کی کہ "فطرت سماج اور انسانی سوچ کا سب سے عمومی قانون ہے۔" انسان نے اپنی خداداد صلاحیت کو کام میں لا کر اشیاء کی شناخت کے لیے نام مقرر کر کے ان کو یاد کر لیا، آدم بھی اسی علم الاسماء یا علم اشیاء کی بدولت فرشتوں پر سبقت لے گیا۔ علم الاسماء یا اشیاء کی وجہ سے انسان نے ہر طرح کے علوم کو (خصوصاً سائنسی علوم) کو مرتب کر کے سائنسی ترقی کو بام عروج پر پہنچا کر زندگی کے لیے ہر طرح کی سہولیات کا اہتمام کیا۔ نظامِ قدرت کے پوشیدہ رازوں کو آشکار کر کے ان کو الفاظ کا جامہ پہنایا۔ چنانچہ آج تمام علوم بصورت الفاظ ہی دستیاب ہیں۔ "مادی اشیاء کی نوعیت اور خصوصیات کو الفاظ میں بیان کرنا جدلیات ہے" ہراقلیطوس کہتا ہے کہ ہر شے رواں دواں ہے اور کسی کو دوام نہیں۔ اقبال کے مطابق "موت ہے اس پر حرام" یعنی مادے پر موت حرام ہے۔

جدلیات فطرت اور معاشرے پر غور و فکر کر کے ان کی تشریح کرنے کا طریقہ کار ہے۔ کائنات کو مسلسل، متغیر اور متحرک دیکھنا جدلیاتی طریقہ کار ہے جو یہ واضح کرتا ہے کہ تغیر اور حرکت کے ساتھ تضاد بھی لازم و ملزوم ہے۔ ترقی کا عمل سیدھا سیدھا نہیں چلتا بلکہ چھوٹی چھوٹی مقداری تبدیلیاں بالآخر یکایک ایک دھماکۂ انقلاب کا باعث بنتی ہیں جہاں مقدار معیار میں بدل جاتی ہے۔ "جدلیات دراصل تضاد کی منطق ہے۔"

مارکس کا بنیادی فلسفہ یہی ہے یہاں کائنات کی مادی حقیقت کو تسلیم کر کے مادہ(Matter) کو تصور (Ideal) سے بہتر مانا جاتا ہے۔ مذہب اس کو نہ مان کر بھی ماننے پر مجبور ہے۔ ٹراٹسکی لکھتا ہے کہ "ہیگل نے نظریاتی سایوں کو حتمی حقیقت سمجھ کر کام کیا"۔ مارکس نے ثابت کیا کہ ان نظریاتی سایوں کی حرکت، مادی اجسام کی حرکت کو منعکس کرنے کے علاوہ کچھ نہیں۔

جدلیاتی مادیت (Dialectical Materialism)

انسانی ذہن خود ایک مکمل وجود رکھتا ہے جب کہ تصور تو اس کی صرف ایک خصوصیت کا نام ہے۔ ذہن ہی انسان کو اپنی تمام مادّی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے براہِ راست مادی اشیاء کو استعمال کرنے کا ڈھنگ سکھاتا ہے۔ جدلیات کی بنیادی بحث ہی مادے کو حقیت تسلیم کر کے ان بنیادی نکات پر بحث کرنا ہے جن پر انسانی تہذیبی، ثقافتی، سائنسی اور سیاسی ترقی ہوئی۔ اس ترقی کو "مادیت کی تنظیم وارتقاء" سے جوڑا جاتا ہے۔ مادّے کو لفظوں کا روپ دے کر

مادّے کی صفات سے استفادہ کیا گیا ہے اسی استفادے سے انسان کو اصل ترقی ملی۔ حرکت مادے کا بنیادی اصول ہے۔ "فطرت صحیح معنوں میں ان چیزوں کی حقیقت ہے جن کے اندر حرکت کا اصول کار فرما ہے۔"[2]

مادہ اور حرکت توانائی کے اظہار کے دو طریقے ہیں۔ جب الیکڑون کی حرکت "معیاری تبدیلی" یا "کوانٹم لیپ" (Quantum Leap) بن جاتی ہے۔ یہاں جدلیات کے تین بنیادی قانون بیان کرنا ضروری ہیں۔

جدلیات کے تین بنیادی اصول ہیں:

1۔ مقدار کی معیار میں تبدیلی کا اُصول

2۔ ضدین کے انضمام کا اُصول

3: نفی کی نفی کا اُصول

(1) مقدار کی معیار میں تبدیلی

یہ بھی ممکن ہے کہ تُو موت سے بھی مر نہ سکے

مقدار کی معیار میں تبدیلی کا قانون بڑے پیمانے پر لاگو ہوتا ہے۔ یہ اصول ہر سطح ہر مقام پر دیکھا جا سکتا ہے۔ چھوٹی تبدیلیاں معیار پر اثر انداز نہیں ہوتیں بلکہ یہ چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ایک خاص معیار پر پہنچ کر ایسا کرتی ہیں۔ ٹراٹسکی کے مطابق ہر انسان کچھ حد تک ماہر جدلیات ہوتا ہے۔ جیسا کہ کھانے میں نمک کی مناسب مقدار و غیرہ۔ موت سے بھی نہ مرنا اور بڑے بڑے نصب العین حاصل کرنا اسی اُصول کے تحت آتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی انفرادی کوششیں بھی بڑی تبدیلی کا باعث بن جاتی ہیں۔

(2) ضدین کے انضمام کا اُصول: (اصول تضاد)

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر

جدلیاتی طرز فکر کا بنیادی نکتہ صرف تبدیلی یا حرکت نہیں بلکہ یہ ہے کہ حرکت اور تبدیلی کی بنیاد تضاد و کشمکش پر ہے۔ اضداد ایک معیاری نکتے پر پہنچ کر آپس میں ضم ہو جاتی ہیں۔ یوں ایک نیا تضاد جنم لیتا ہے۔ یعنی پرانی تعمیر کی نئی تخریب جس کا حصول نئی تعمیر کی صورت میں واضح ہوتا ہے (اقبال کا تصور خیر و شر)۔ خیال پرستانہ روایتی

---

[2] ارسطو از مارکسی فلسفہ او جدید سائنس، ص 71

فکر، تضاد کے عنصر کو ختم کر کے، فکر میں جمود لانا چاہتی ہے۔ جب کہ حرکت (جو مادے کے اندر موجود ہے) ہر طرح کی تبدیلی، ترقی اور زندگی کا سرچشمہ ہے۔ تضادات پر پہرہ لگانے سے نئے نظریات و تصورات جنم نہیں لیتے جو ارتقا کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ ارتقا کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے سے ارتقاء وقتی طور پر رُک تو جاتا ہے مگر اس کا نتیجہ بالآخر انقلاب کی صورت میں نکلتا ہے۔ انقلاب کبھی پُر سکون نہ ہو کر ہمیشہ خون سے رنگا ہوتا ہے۔

(3) نفی کی نفی

لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

یکے بعد دیگرے تضادات کے انضمام سے سامنے آنے والے تضادات ہی حقیقی ترقی کا باعث ہیں۔ نفی کی نفی دراصل شعوری ترقی کا تصور ہے۔ جیسے سادہ سے مشکل، ادنی سے اعلیٰ۔ زمان و مکان، جبر و قدر اور اصولِ حرکت کے سلسلے میں اسی اصول کے تحت بحث کی جاتی ہے۔ نفی کی نفی جدیدیت کی راہ ہے جو انسانیت کو کامیابی کی راہ پر لے جاتی ہے۔ جدلیات کے یہ تین اصول ہر طرح کی جدلیات میں کار فرما ہیں۔

معاشرتی جدلیات:

افلاس خدا کی طرف سے نازل کردہ کوئی آسمانی آزمائش نہیں بلکہ بہت محنت اور خلوصِ دل سے کی گئی انسانی سفاکانہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ طبقات یوں ہی وجود میں نہیں آتے بلکہ اس کے پیچھے لاکھوں سالوں کی مذموم و مکارانہ تھیور کریٹ تگ و دو چھپی ہوتی ہے۔ مذموم و مکارانہ اس لیے، کیونکہ مذہبی تگ و دو کبھی اچھی بھی ہو سکتی ہے مگر انفرادی طور پر جب بھی مذہبی سوچ نے گروہ بنایا تو نتیجہ استحصالی ہی نکلا ہے۔

"Historical action is to yield to their personal inventive action, historically created conditions of emancipation to fantastic ones, and the gradual and spontaneous class - organization of proletariat, to the organization of society specially contrived by these inventors. Future history resolve itself, in their eyes into the propaganda and the practical carrying out of their social plans.[3]

معاشرتی جدلیات کا نہایت سادہ ترین مطلب "ریاست کا قیام" ہے۔ انسان کا ارتقا ہر شے کے ارتقا کا باعث بنتا ہے۔ انسانوں نے عہد وحشت سے نکل کر گروہ بندیاں کیں۔ قبیلہ داری نظام تشکیل دیا جو بالآخر ریاست کی

---

[3] "Communist Manifesto" by Marx & Engels, English Edition of 1880, p 46.

شکل میں صورت پذیر ہوا۔ جدلیات کے مادی اصول "مقدار کی معیار" میں تبدیلی اور نظریہ اضدایت انسان کا ریاست تک کا سفر سمجھنے میں انسان کی مدد کرتے ہیں۔ یہ سب تاریخی، سائنسی اور مذہبی جدلیات کے بغیر ناممکن تھا جس کا بنیادی منبع، مادہ اور اس کی حرکت ہے۔ مادے کی مسلسل حرکت ارتقاء کا باعث ہے جو اپنے اندر اضدایت کی صفت حیات رکھتی ہے۔ یہ مادی جنگ وجدل طبقاتی جدوجہد (Class Struggle) نفی کی نفی اور "مقدار کے معیار میں بدلنے کے اصول ہی تھے، جو ریاست کے قیام کا باعث بنے۔

"The history of all hitherto existing societies is the history of class struggle"[4]

تمام تاریخ دراصل طبقاتی جدوجہد کی کہانی ہے۔ ابتدائی قیام ریاست سے پہلے خاندان گھرانے اور قبائل معاشرتی تنظیم کا نمونہ تھے جو کسی بھی علاقے کی سب سے خود مختار، مقتدر سیاسی تنظیم ہوتی تھی۔ جب معاشرہ پدری نظام میں تبدیل ہوا تو طبقات نے وجود لیا۔ جب ذرائع دولت آفرینی (زمین، پیداوار، آلات پیداوار) چند افراد ذاتی ملکیت بن گئے تو ریاست نے جنم لیا۔ جب انسان نے اختیار و دولت بڑھالی تو مفادات کا تحفظ ناگزیر ہو گیا۔ ریاست طبقاتی تقسیم کا اعلانیہ ثبوت ہے۔ ریاست عوام و خواص کے مفادات کے درمیان تفریق سے جنم لیتی ہے۔ اس کا بنیادی کام سماج کے تضادات کو "تیسری قوت" کی حیثیت سے قائم رکھنا ہے۔ مارکس کے مطابق جب سماجی تضادات، معاشرتی و معاشی نابرابری ختم ہو جائے گی تو سماج طاقتور ہو جائے گا یوں ریاست بھی کمیتی تبدیلیوں کے نتیجے میں اپنا وجود کھو دے گی۔ جب لوگوں کے درمیان جھگڑا ہی نہیں ہو گا تو وکیل اور جج، پولیس اور تھانہ، جیل اور قانون سازوں کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ یوں ان کی مراعات اور یہ طبقہ بھی ختم ہو جائے گا۔ دراصل قانون ساز طبقہ نے نوع انسانی کو غلامی کی زنجیروں میں بُری طرح باندھ رکھا ہے۔

ریاست کا کام حکمران طبقے کا تحفظ ہے چاہے وہ ریاست تھیوکریٹ ہو جمہوری ہو یا اشتراکی۔ ریاست بنیادی طور پر طبقاتی ادارہ ہے۔ تھیوکریٹ ریاست مذہبی پیشواؤں کا، ملوکیت شاہی خاندان کا، اور بورژوا جمہوریت سرمایہ دار طبقے کا تحفظ کرتی ہے۔ خالص جدلیات انداز میں اینجلز 'اینٹی ڈیورنگ' میں لکھتا ہے

"ریاست کسی طرح ایسی طاقت کا نام نہیں ہے جو سماج پر باہر سے مسلط کی گئی ہو، ایسی طاقت جو سماج کے اندر سے پیدا ہوتی ہے لیکن اپنے آپ کو اس سے بالاتر رکھتی ہے اور سماج سے بے گانہ ہو جاتی ہے۔ ریاست ہے۔[5]

---

[4] Ibid, p.3

[5] نوید فکر، سید سبطِ حسن، کراچی: مکتبہ دانیال، انیسویں ایڈیشن 2016ء، ص 8

ارتقاء کا کام تبدیلی لانا ہے۔ سبط حسن طبقاتی تفاوت کی صورتحال پر اپنی کتاب "پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء" میں لکھتے ہیں کہ "افلاطون کے مطابق ہر شہر میں دو شہر ہوتے ہیں ایک امیروں کا اور دوسرا غریبوں کا اور دونوں کے اخلاق و عادات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔" جو طبقاتی جدلیات اور ریاست کے وجود کا ثبوت ہے۔ مارکس کے مطابق ریاست طبقاتی تضادات کے ناقابلِ مصالحت تصادم کی پیداوار ہے۔ جہاں طبقاتی تضادات کی مصالحت نہیں ہو سکتی، وہاں ریاست جنم لیتی ہے۔ جب قبائلی نظام کی جھول (loop holes) نے موقع فراہم کیا تو طاقت نے ملوکیت کو رواج دیا، جہاں اولاً اقتدارِ اعلیٰ کا مالک بادشاہ تھا۔ مقنّنہ و عدلیہ کے اختیارات مذہبی طبقے کے پاس تھے جو جائز ناجائز، جرم و سزا اور فرائض و حقوق کا تعین کرتے تھے۔ بادشاہوں نے بھی مذہبی طبقے کی حدود میں دخل نہ دیا مگر رفتہ رفتہ ریاست پر پوری طرح قابض ہو کر خود کو خدا کا اوتار یا نائب کہلوایا۔ باشادہ کی شخصیت کے گرد تقدس کا جو ہالہ ان پروہتوں نے چھ ہزار برس پہلے بُنا تھا ملوکیت کے زوال تک مشرق و مغرب میں تھوڑے ٹھوڑے فرق سے ہر جگہ بدستور قائم رہا۔

کاروبار شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجود میر و سلطان پر نہیں مُنحصر [6]

چنانچہ اسلامی سلطنت میں بھی "ظل اللہ" کا لقب ملتا رہا۔ قاضی ماوردی نے "احکام السلطانیہ" میں، امام غزالی نے "نصیحت الملوک" میں، نظام الملک طوسی نے "سیاست نامے" میں، اور ابو نصر فارابی نے "الآرا مدینہ الفاضلہ" میں، جب کہ ابن خلدون نے "تاریخ" میں "اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم" (4/59) کی تفاسیر کی آڑ میں مسلمانوں کو حاکم وقت کی اطاعت کا جو سبق دیا وہ غیر مذہبی پیشواؤں کی تلقین سے مختلف نہیں تھا۔ اقبال نے "امامت" کے عنوان سے ضربِ کلیم میں لکھا:

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست

---

[6] ارمغان حجاز ابلیس کی مجلسِ شوریٰ، کلیاتِ اقبال۔ ڈاکٹر محمد اقبال، اکیڈمی اقبال لاہور، صفحہ 704/12

زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے
فتنہ ملت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے[7]

یہی وجہ ہے کہ مسلمان فاتحین ہوں، حکمران ہوں یا حکومتی مفکرین ان کی تاویلات نے اسلام کے احکامات کو اپنی مرضی سے تاویل بنا کر پیش کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومتی مفکرین کی یہ تاریخی غلطیاں اسلام کے ساتھ بطور دین نتھی ہو گئیں۔

ملوکیت نے بادشاہ کو مقدس ترین شے بنا دیا۔ تھیوکریسی میں "عالم بالا" سے نازل ہونے والے قانون کو مقدس اور واجب التعظیم بنانے کے لیے خدا کا نام بڑی کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ تھیوکریٹ ریاست میں مذہبی اجارہ دار اور ان کے پیروکار بادشاہ کو خدا بنا کر عوام پر مسلط کرتے ہیں۔ دربار اور قانون بھی مذہبی طبقے کا ہوتا ہے۔

بہت پھیلی ہوئی ریاست ایسی نہیں تھی جس کا کوئی نظریہ نہ ہو۔ چنانچہ نظریاتی ریاست ہونا کسی قسم کی خوبی نہیں بلکہ ذہنی غلامی کی نشاندہی ہے۔ تھیوکرسی کی افیون عوام کا مقدر ہے خواص اس پر صرف اتنا عمل کرتے ہیں جتنا عوام کو دکھانا مقصود ہو۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کا "آسمانی حق" تسلیم کرتا اور موقع ملتے ہی لشکر کشی کر کے جدال و قتال برپا نہ کرتا۔ نہ شاہی خاندان بدلتے نہ کسی شاہ کو زہر دیا جاتا اور نہ ہی قتل کیا جاتا۔

تھیوکریٹ ریاست میں بادشاہ کا مذہب سرکاری مذہب ہوتا تھا۔ جہاں سربراہِ مملکت اور مذہبی ادارے عوام کے لیے چکی کے دو پاٹ تھے۔ معاشرتی و معاشی نظام، طرزِ حکومت کے متعلق قوانین سے عوام کو قطعاً لاتعلق رکھا جاتا تھا۔ اسی لیے حضرت عیسیٰؑ نے کہا کہ "سیزر کو اسکا حق دو اور خدا کو اس کا حق" یعنی مذہب کو ریاست سے الگ کر دو۔

پھر تھیوکرسی کی مدت پوری ہوئی۔ سوئی بھیڑیں جب بھیڑیئے بن گئیں تو مذہبی پیشواؤں کو سر چھپانے کی جگہ ڈھونڈنا دشوار ہو گئی۔ یورپ میں کلیسا بڑی طاقت تھا۔ کلیسائے روم کی پہلی ٹکر فرانس، جرمنی، سپین اور برطانیہ کے بادشاہوں سے ہوئی۔ چودھویں صدی میں یہ تنازع اتنا شدید ہوا کہ فلپ چہارم (فرانس کے بادشاہ) نے پوپ کلیموں پنجم کو گرفتار کر کے کلیسا کا صدر مقام بھی منتقل کر دیا۔ اس سے کلیسا کا اثر و رسوخ بہت متاثر ہوا۔ مغربی

[7] ضربِ کلیم، کلیاتِ اقبال، ڈاکٹر محمد اقبال، اکیڈمی اقبال لاہور، صفحہ 562/62

مورخین کلیسا کے ہزار سالہ عہد کو "عہد تاریک" سے تعبیر کرتے ہیں جہاں ہر طرف تعصب، تنگ نظری اور توہم پرستی کا راج تھا۔

جب اٹلی میں صنعت و حرفت کا چرچا ہوا تو سرمایہ دار طبقے کے فروغ سے کلیسا کے مفاد پر کاری ضرب لگی۔ اب تھیوکریٹ زمیندار ریاست کے مقابلے میں ایک سرمایہ دار ریاست کھڑی تھی۔ زمیندار کے مزارعوں نے شہروں میں صنعتوں کا رُخ کیا۔ یوں پادریوں اور نوابوں کے تعلقات سرمایہ دار سے بگڑے۔ یہاں مادیت جدلیاتی انداز میں کار فرما تھی کہ ہر کشمکش، ہر تضاد کے بعد ایک نسبتاً بہتر صورتِ حال سامنے آئی۔ یعنی تھیوکریسی کی جگہ زمینداری اور پھر سرمایہ داری نے لے لی تھی۔

اگرچہ یہ بہتری عام آدمی کے لیے اتنی قابلِ قدر نہیں تھی جتنی کہ ہونا چاہیے تھی۔ مارٹن لوتھر اور تھامس مونزر کی بغاوت سے پروٹسٹنٹ فرقہ وجود میں آیا جس کی بنیادی تعلیمات نے فیوڈل طبقے کو ہلا کر رکھ دیا۔ پھر تاجروں اور صنعت کاروں نے بھی اُمور ریاست کے

نظم و نسق میں شرکت کا مطالبہ کر دیا۔ اس سب سے اضدادی نظریہ کے مطابق پہلے سے کچھ تو بہتر ہوا۔ مذہبی پیشوا اور بادشاہ کے علاوہ تاجروں اور صنعت کاروں کو بھی ملا کر حکومت بنائی گئی تھی۔ اگرچہ اس نئے نظامِ جمہوریت میں بھی خواص ہی کا خیال رکھا گیا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ بادشاہ اور پادری سے ان کا "الوہی مقام" چھن گیا اور اقتدار اعلیٰ کا مرکز پارلیمنٹ ٹھہرا۔

مارکس کہتا ہے کہ انسانی ضرورتیں پہلے اہم ہیں۔ ماورائی اور روحانی تشنگی کا دراومدار مادی حقیقت حال پر ہے۔ اس بڑی کامیابی نے جاگیر دارنہ نظام کو ہلا کر رکھ دیا۔ ارتقاء کا کام تبدیلی لانا ہے۔ جب کہ تھیوکریسی انسان کو پیچھے کی طرف لے جاتی ہے جو ماضی کے سنہرے خواب دکھا کر اجتہاد کی جگہ تقلید اور تحقیق کی جگہ روایت پرستی کی تعلیم دیتی ہے۔ اب اس پرانی فرسودہ توہم پرستی کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ سائنسی علوم نے مفروضات کا بھرم کھول کر جمہوریت کی راہ ہموار کر دی تھی۔ یہاں مارکس خوش ہے کہ کم از کم طاقت اور وسائل دو لوگوں کے قبضے سے نکل کر چار لوگوں میں تقسیم ہو گی۔ اب اس کو فطری جدلیات کے تحت مزید تقسیم بلکہ تقسیم در تقسیم ہونا ہے۔

البتہ وہ جمہوریت کو کسی طرح کی نیلم پری نہیں مانتا۔ اس کا نظریۂ اضدایت اور نفی کی نفی یہ بتاتے ہیں کہ ہر تعمیر کے اندر اس کی تخریب کا عمل پوشیدہ ہے۔ اگرچہ طاقت اور وسائل کے اب دو کی جگہ چار مالک بن گئے لیکن مارکس کو یہ جمہوریت بھی مشکوک نظر آتی ہے۔ جمہوریت میں اس کو سرمایہ دار کی چیرہ دستی نظر آتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے تھیوکریسی میں ملوکیت اور زمیندار کی عیاری کار فرما تھی۔ اس جمہوریت نے سرمایہ دار طبقے کی مراعات

کا تحفظ کیا اور معاشرے کو دو ان مٹ طبقوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک بورژوازی اور دوسرا پرولتاریہ۔ بوژوازی (سرمایہ دار) نے پرولتاریہ (مزدور) کا سابقہ استحصال من و عن جاری رکھا۔ تاہم پہلے پہلے جو کچھ الوہی استحقاق سے "الوہی افراد" غصب کرتے تھے وہ جمہوریت نے سیدھے سیدھے انداز میں لے لیا۔

The bourgeoisie, historically, has played a most revolutionary part. The bourgeoisie, wherever it has got the upper hand, has put on end to all feudal,..... It has as under pitilessly torn the motley feudal ties that bound man to his " natural superiors " and has left remaining no other nexus between man and man that naked self-interest than callous "cash payment" . It has resolved personal worth into exchange value, and in place of the numberless and indefeasible chartered freedom, has set up that single, unconscionable freedom-free trade in one word, for exploitation, veiled by religious and political illusions, into naked shameless, direct, brutal exploitation.[8]

سرمایہ دارنہ نظام نے جمہوریت کی شکل میں یہاں کھلے عام اور واضح الفاظ میں وہی استحصال کیا جو کہ مذہبی ملوکیت چھپ چھپا کر کیا کرتی تھی۔ البتہ اب ہر شے ایک جنس تھی، جس کا تبادلہ ہو سکتا تھا، حتی کہ انسان بھی اور اس کی محنت بھی۔ مارکسی نقطۂ نظر سے یہ بھی ایک "جدلیاتی جست" تھی۔

اب اس نئے نظام نے ایک نئی طرح کا جال بچھا کر مقامی علاقے سے نکل کر بقیہ دنیا پر اپنے قدم جمائے۔ مارکس اس کے مضمرات سے انجان نہ تھا۔ چنانچہ لکھتا ہے:

Just as it has made the country dependent on the town, so it has made barbarian and semi barbarian countries dependent on the civilized one, nation of peasants on nations of bourgeois, the east on west.[9]

اس سب نے مزور طبقے کی مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا کیونکہ بلا امتیاز ضعف و عمر تمام انسان صرف سرمایے کی پیداوار کا آلہ کار قرار پائے۔

Difference of age and sex have no longer any distinctive social validity for the working class. All are instrument of labour, more or less expansive to use, according to their age and sex proletarians do not fight their enemies, but the enemies of their enemies , the remnants of absolute monarchy, the land owners, the non bourgeois the petty bourgeoisie.[10]

---

[8] Communist Manifesto by Marx & Engels p.6.
[9] Ibid, p.9
[10] Ibid, p.13-15

ماضی کے تمام نچلے اور درمیانے طبقات جو معاشرے میں ہمیشہ اپنی عزت کو بمشکل بنائے رکھتے تھے پرولتاریہ قرار پائے۔ جن میں تاجر، دکان دار، اور ہنر مند تمام لوگ شامل ہیں۔

The lower strata of the middle class.... the small trades people, shopkeepers, retired tradesmen generally, the handicraftsmen and peasants all these sink gradually into the proletariat.[11]

اینجلز لکھتا ہے کہ: "جمہوری ری پبلک میں دولت اپنی طاقت بالواسطہ استعمال کرتی ہے۔ لیکن پہلے سے زیادہ اعتماد کے ساتھ۔ پہلے "افسروں کو براہِ راست رشوت دے کر" دوسرے "حکومت اور سٹاک ایکسچینج کے اتحاد کے ذریعے" وہ جمہوریت کے بجائے یوں ادھیڑتا ہے کہ عام حق رائے دہی (ووٹ) بورژوازی تسلط کا آلہ کار ہے جو مزدوروں (پرولتاریہ) کی پختگی کا پیمانہ ہے۔ تاکہ مزور ہمیشہ پرولتاریہ ہی رہے اور کبھی حلقہ زنجیر کو توڑنے کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ یہی ہوا کہ مزدور کو توروٹی کے لالے پڑے ہیں۔ پیٹ ہی نہیں بھرے گا تو آئین و قانون کے بارے میں کون سوچے گا۔ مزدور صرف پسینہ بہائے گا۔ جمہوری ریاست میں نہ تو وہ اس سے زیادہ دے سکتا ہے اور نہ کبھی دے گا۔

"It has converted the physician , the lawyer the priest, the poet, the man of science, into its paid wage labourers..... All that is solid is malted into the air. All that is holy is profaned, and man is at last compelled to faced with sober senses , his real condition of life, and his relations with mankind.[12]

اتنے بے رحم اور ظالمانہ نظام کے بارے میں مارکس کی رائے ہے کہ وہ اپنے دن پورے کر چکا ہے۔ اس کے متبادل مارکس اپنا "عالمگیر اشتراکی نظام" پیش کرتا ہے جو کہ جمہوری نظام کی ضد، یعنی پرولتاریہ طبقہ سے جنم لے گا۔ ریاست جب ان کے ماتحت ہو گی تو پھر وسائل کی تقسیم منصفانہ ہو گی۔ اب "قدر زائد" سرمایہ دار، زمین، آلات پیداوار کے علاوہ محنت کار بھی برابر حصہ دار ہو گا۔ اب قدر زائد چند لوگوں کے ہاتھوں میں سمٹنے کی بجائے ریاست کی ملکیت ہو۔ مساوات اور برابری کے اصولوں کے تحت چلنے کی وجہ سے مسابقت نہ ہو گی۔ چنانچہ دنیا کو چھوٹے چھوٹے خطوں اور ملکوں میں بانٹنے کی ضرورت نہ ہو گی یوں طبقات ختم ہو جائیں گے اور جب طبقات ختم ہو جائیں گے تو ریاست کا وجود رفتہ رفتہ خود بخود مٹ جائے گا۔ البتہ قوانین سے منحرف ہونے والوں کے لیے سخت سزائیں بھی ہیں لیکن وہ سزائیں معاشرتی اور معاشی معاملے پر ہیں مذہب کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یعنی "سیرز کو اسکا حق مل جائے گا

---

[11] Ibid, p. 14
[12] Ibid, p. 6-7

اور "خدا کو اپنا حق مل جائے گا۔ سب کو اپنے مذہبی معاملات مذہب کے مطابق اختیار کرنے کا حق ہے جب کہ ریاستی معاملات میں مذہب کا دخل بالکل نہیں مانا جائے گا۔

اگر سادہ انداز میں دیکھا جائے تو مارکس کی ریاست بنیادی طور پر معاشی عدم مساوات کے خلاف جنگ کر کے قائم ہوتی ہے جو "معاشی مساوات پر قائم معاشرہ ہے" جہاں انسانی مادی ضرورت کو پہلے پورا کر کے روحانی تعلیم بعد میں دی جاتی ہے۔

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمین کے ہنگامے
بُری ہے مستیء اندیشہ ہائے افلاکی

مارکس کی یہ ریاست "یوٹوپیا کی ریاست" نہیں بلکہ خالص زمینی حقائق اور مسائل پر مبنی ایک ریاست ہے جس کا حل بھی زمینی حقائق پر مشتمل ہے۔ پہلے تو تمام محنت کاروں کو نچلے طبقے میں دھکیل دینا، اور پھر انتہائی بنیادی مادی ضرورتوں کے لیے بھی ان طبقات کی بے بسی پر مارکس کڑھتا ہے۔ اس نے معاشی جدلیات کے تحت پرولتاریہ کے خوفناک استحصال کا پیمانہ وضع کر دیا جس کو اس سے پہلے ناپنے کا نہ کوئی پیمانہ موجود تھا اور نہ ہی تصور۔ اس خوفناک خیال کی پیش کاری سے دنیا میں ہلچل مچ گئی اور پہلی مرتبہ پسے ہوئے طبقات کو اپنے استحصال کا اندازہ ہوا:

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

معاشی جدلیات

مارکس کی معاشیات پرولتاریہ اور بورژوازی طبقے کے گرد گھومتی ہے۔ جب کہ موجودہ دور میں ایک تیسرا عنصر پیٹی بورژوا بھی شامل ہے۔ جس کا وجود قائم رکھنا خود اس کے لیے ایک بڑا سوال ہے۔ مارکس کے طبقاتی تضاد کا گہرا تعلق "قدر زائد" اور "تبادلہ" سے ہے۔ مارکس نے "داس کیپٹل" میں قدر کے متعلق لکھا:

Value= The utility of a thing makes it a use-value. But his utility is not a thing of air. Being limited by physical properties of the commodity, it has no existence apart from that commodity.[13]

دنیا کی ہر جنس انسانی محنت اور مادہِ قدرت سے مرکب ہے۔ جنس میں محنت سے قدر پیدا ہوتی ہے۔ اگر انجن سے انسانی محنت کا نکال دیں تو وہ کان میں پڑا خام لوہارہ جاتا ہے۔ جو جنگل اور پہاڑوں کے طرح صرف قدرت کا

[13] Das Kapital , Karl Marx, published in U.N. imprint of Pacific Publishing Studio 2010, Ch. 1 p.1

عطیہ ہے۔ قدرت مادے کی شکل بدلتی ہے اور انسان بھی اپنی ذہنی اور جسمانی محنت سے مادے کی شکل کو تبدیل کر کے قابلِ استعمال بناتا ہے۔ جس کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کُہسار و زاغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

انسانی محنت سے مادے میں جنم لینے والی تبدیلی "قدر" کہلاتی ہے۔ انسانی محنت کو نوعیت اور مقدار کے لحاظ سے دیکھا جاتا ہے۔ چارٹ کچھ یوں بنتا ہے۔

انسانی محنت (بلحاظ کمیت / عام محنت بلحاظ کیفیت / خاص محنت Abstract Labour Concrete labour)

قدرِ اصل قدرِ افادہ

محنت بلحاظ کیفیت کسی خاص نوعیت کی محنت ہوتی ہے (مثلاً درزی، بڑھئی، کمہار یا موچی) جو جنس میں قدر پیدا کر کے اسے کسی قابل بناتی ہے۔ جب کہ محنت بلحاظ کمیت انسان کے اعصاب کو تھکا دیتی ہے۔ اس الگ طرح کی محنت میں بھی قوت عمل صرف ہوتی ہے۔ جہاں محنت کی مدت اور شدت کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ جو کہ جنس میں قدر اصل پیدا کرتی ہے۔ مارکس جب کہتا ہے کہ لوہا = اناج = ہیرے کے، تو یہاں اجناس کو کیفیت کی شدت سے نہیں بلکہ نوعیت کی شدت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ انسانی محنت ہر پیداوار کا لازمی حصہ ہے۔ جو بیک وقت خاص بھی ہے اور عام بھی جو اجناس کے اندر اصل اور قدر افادہ پیدا کرتی ہے۔

مارکس کے مطابق جنس میں لگی محنت اس میں لگی پیداواری طاقت کی مقدار کے الٹے تناسب میں گھٹتی یا بڑھتی ہے۔ یعنی کم محنت سے زیادہ پیداوار کو کہا جائے گا محنت کی پیداوار بڑھ گئی جب کہ دوسری صورت میں کہا جائے گا کہ محنت کی پیداوار گھٹ گئی۔ محنت کا مطلب خاص وقت میں پیداوار کے عام رائج حالات کے ماتحت اوسط درجہ کی ایسی پھرتی اور ہنر مندی جو ایک چیز کو پیدا کرنے کے لیے لازم ہو۔ خاص محنت کی دو اقسام ہیں ایک عام سماجی محنت، دوسرے ہنر مند محنت (مرکب) محنت جو ایک نئے خام مزدور اور ہنر مند مزدور کے فرق کو بیان کرتی ہے۔ اگر

دونوں مزدوروں کی اجرت برابر کر دی جائے تو کچھ عرصے بعد ہنر مند محنت کش ملنا مشکل ہو جائیں گے کیونکہ جب محنتانہ مساوی ہے تو کیا ضروری ہے کہ ایک لمبے عرصے تک کسی خاص ہنر کو سیکھا جائے۔ اس میں وقت اور محنت اور پیسہ کیوں خرچ کیا جائے۔ یوں ہنر مندوں کی کمی سے ان کی طلب میں اضافہ ہو گا۔ جو بلآخر ان کی ایک گھنٹے کی محنت کو چھ گھنٹوں کے برابر یا اس سے زیادہ کر دے گا۔

قدر اصل ہی قدر تبادلہ ہے جو انسانی کی "تجریدی معیاری لازمی محنت" سے پیدا ہوتی ہے۔ جب کہ جنس کی قدر افادہ اور قدر مبادلہ میں ایک لازمی تضاد ہے۔ وہ یہ کہ محنت کش کے لیے جنس میں افادی قدر نہیں بلکہ قدر مبادلہ ہے جب کہ خریدار کے لیے قدر مبادلہ کی جگہ قدر افادی اہم ہے۔ ایسی صورت میں جنس سماج کے لیے ایک ایجنٹ کا کام کر کے مخصوص رشتہ بناتی ہے جو پیداواری اشیاء کے بنیادی تناقص کا اظہار ہے یعنی تیسری قوت ہے جس کو معاشرتی جدلیات میں ریاست کے قیام کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ یہیں سے حکمرانی کا بنیادی عنصر متحرک ہو کر سماج کو غلام بنانے کا کام کرتا ہے۔

اجتماعی طور پر پیداواری لحاظ سے کسی ایک فرد کا کام سماج کی مجموعی محنت کے سمندر میں قطرہ ہے جب کہ انفرادی طور پر مزدور کی خاص محنت کا نتیجہ ہے۔ اجناس کی پیداوار سماجی تعلقات کا ایسا سلسلہ ہے جس میں الگ الگ پیداوار گنند گان مختلف اشیاء پیدا کرتے ہیں جس میں یہ تمام اجناس قدر تبادلہ کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ برابر کر دی جاتی ہیں۔ "قدر تبادلہ" نسبتی شئے ہے جو رسد اور طلب کی کشمکش سے بنتی ہے۔ یہ بذاتِ خود کوئی قدر پیدا نہیں کرتی۔ قدر اصل، سماج کو طلب و رسد برابر کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ جنس اتنی مقدار میں بنے کہ اس میں نفع، نقصان باقی نہ رہے بلکہ اس کا تبادلہ قدر اصل پر ہو۔ نفع و نقصان قدر اصل کے ہتھیار ہیں جو جنس کی قلّت و کثرت مٹا کر رسد اور طلب میں ہمواری پیدا کرتے ہیں۔ تاکہ اجناس کا تبادلہ قدر اصل پر ہو۔ ہر وہ شے جنس ہے جس کا تبادلہ ہو سکے۔ ہر معاشرے کے افراد تبادلہ اجناس کرتے ہیں اسی بات سے پتا لگایا جاتا ہے کہ معاشرہ کن بنیادوں پر استوار ہے۔

" The value of commodities has a purely social reality, and that they acquire this reality only in so far as they are expressions or embodiments of one identical social substance, viz, human labour, it follows as a matter of course, that value can only manifest itself in the social relation of commodity to commodity.[14]

[14]Ibid, p.23

اگر کسی سماج میں اجناس کا تبادلہ "قدر استعمال" کے نقطہ نظر سے ہو گا تو وہ اشتمالی کمیونسٹ سماج ہو گا۔ اگر کسی سماج میں یہ تبادلہ "قدر اصل" کے نقطہ نظر سے ہو گا تو وہ اشتراکی سماج کہلائے گا اور اگر یہی تبادلہ "قدر تبادلہ" کے نقطہ نظر سے ہو جیسا کہ فی الزمانہ ہو رہا ہے تو یہ سماج سرمایہ دارانہ کہلائے گا۔ یہاں ہم ابتداء کی طرف لوٹ جاتے ہیں کہ "نظریہ سماج کا معکوس شعور ہے (جو اقتصادی، سیاسی، قانونی، مذہبی اور تاریخی ہے) کا ردِ عمل ہے"۔ نظریات کے پروان چڑھنے سے معاشرتی و معاشی نظام وجود پاتے ہیں یا نظامات سے نظریات جنم لیتے ہیں۔ یہ اضدایت بہر حال انسان کو ارتقاء کی طرف لے جاتی ہے۔ ارتقاء کو دبایا جائے تو پھر انقلاب آتا ہے مارکس کا کہنا یہی ہے کہ ہمیشہ سے ایک مخصوص طبقے کو ارتقاء سے روکا گیا ہے جو بالآخر انقلابات کا سبب بنے گا۔

سونا سرمایہ داری نظام کی زنجیر کی پہلی کڑی ہے۔ جس کا نمائندہ روپیہ ہے۔ پہلی صورت میں روپیہ صرف گردش کا پیمانہ ہو گا جہاں گردش کا مقصد صرف کھانا، پینا اور خرچ کرنا ہے۔ جب کہ دوسری صورت میں روپیہ سرمایہ بن جاتا ہے جہاں گردش کا مقصد روپیہ لگانا اور بڑھانا ہے۔ تجارت میں کبھی نفع کبھی نقصان تجارت کو برابر یعنی قدر اصل پر رکھتے ہیں۔ اگر سرمایہ بڑھانا مقصود ہے تو مزدور کی محنت کے اوقات کار اضافی کرنا ضروری ہیں۔ جس کا سراسر خالص نفع سرمایہ دار کو ملتا ہے۔

مارکس اس ضمن میں زندہ اور مردہ سرمایہ کا ذکر کرتا ہے۔ جب محنت کش کی محنت ایک جنس (Product) کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے تو اس وقت مردہ سرمایہ کہلاتی ہے۔ زندہ سرمایہ وہ ہے جس سے محنت کش کی کام کی طاقت خریدی جائے۔ مزدور کی محنت اپنی قدر سے زیادہ قدر پیدا کرتی ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ "زندہ سرمایہ اپنی قدر سے زیادہ قدر پیدا کرتا ہے۔ یہی سرمایہ دار کی طاقت اور سرمایہ بڑھنے کا راز ہے کہ زندہ سرمایہ ہی قدر زائد پیدا کرتا ہے۔

" The surplus value produced by prolongation of the working -day, I call absolute (surplus -value). On the other hand, the surplus-value arising from the curtailment of the necessary labour-time and from the corresponding alteration in the respective lengths of the two components of the working -day, I call relative surplus-value."[15]

قدر زائد کا نظریہ مارکسی اقتصادیات میں بنیادی نظریہ ہے۔ مارکس سرمایہ کو بے جان محنت کہتا ہے، جو ڈائن کی طرح جاندار محنت کا خون چوس کر ہی زندہ رہ سکتی ہے۔ مزدور کی محنت دن کے دو حصوں میں بٹی ہوتی ہے۔

---

[15] Ibid, p.38

ایک حصے کی اجرت اسے ملتی ہے جب کہ دوسرے کی اُجرت سرمایہ دار کا نفع بڑھاتی ہے۔ اس کا چارٹ کچھ یوں بنے گا:

کل محنت 12 گھنٹے

6 گھنٹے 6 گھنٹے

زائد محنت لازمی محنت

قدرِ زائد۔۔ اصل قدر

سرمایہ دار صرف اسی پر اکتفاء نہیں کرتا بلکہ "متجاوز قدر زائد" کے ذریعے مزید نفع حاصل کرتا ہے۔ یہ سلسلہ انفرادی و اجتماعی محنت کشوں کے استحصال سے بڑھ کر غریب ممالک کے استحصال کا باعث بنتا ہے۔ مثلاً محکوم سے "خام مال" سستے داموں حاصل کرکے، اور مزدور کی اُجرت کو مزید کم کرکے۔ یوں مزدور کی محنت تو کم نہیں ہوتی البتہ سرمایہ دار کو مزید رقم بچ جاتی ہے۔

ماحاصل

سرمایہ دارانہ نظام میں عام لوگوں کی تمام زندگی کو مشقت کے گھنٹوں میں تبدیل کرکے صرف ایک طبقہ فرصت اور آرام میں اپنا تمام وقت ہاتھ پر ہاتھ دھرے، بے فکری سے زندگی گزار رہا ہے۔ مارکس یہاں کارخانے کے وجود آنے کی باریکیاں بتا کر زمانے کی آنکھیں کھولتا ہے کہ دار صل ماہر کاری گر کو بے روزگار بنانا اور طے شدہ وقت میں بہت سے لوگوں سے ایک ہی کام کی تکمیل کروانا سرمایہ دار کی عیاری ہے۔ جنس کو سماجی معیاری لازمی محنت کی حدود کے اندر تیار کرنا سرمایہ دارانہ نظام کا اٹل قانون ہے۔ یہ اجتماعی دستکاری صرف ماہر کاری گر کو اناڑی میں نہیں بدلتے بلکہ سماج میں بھی کارخانے کی طرز پر بڑے پیمانے پر تقسیم کار ہوتی ہے۔ جس طرح ہر مزدور کارخانے میں مختلف کام کرتا ہے اسی طرح سماج میں ہر مختلف طبقہ ایک الگ کام کرتا ہے اس سے دنیا میں گاؤں اور شہر کی تقسیم شروع ہو جاتی ہے۔ دماغی کام کرنے والے اور مزدور شہر میں کام کرتے ہیں۔ جب کہ اناڑی محنت کش دیہات میں رہ جاتے ہیں۔ یہ استحصال صرف شہر و دیہات تک محدود نہیں رہتا بلکہ بڑھ کر دنیا میں پھیل جاتا ہے۔

اجتماعی طریقہ پیداوار تاریخی طور پر انفرادی دستکاری کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ سرمایہ کار ہی مزدور کو قدر زائد بلکہ متجاوز قدر زائد پیدا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہاں اس ساری بحث کا نچوڑ یہ نہیں کہ مارکس صنعتی ترقی کے خلاف ہے۔ مارکس تاریخی انفرادی دستکاری کی طرف لوٹ کر نہیں جانا چاہتا ہے بلکہ یہاں پر وہ ایک اور عیاری کا پردہ چاک کرتا ہے کہ اصل میں قدر تبادلہ کو بزور طاقت نافذ کروانے کا مقصد صرف "سرمایہ" کا حصول نہیں بلکہ یہ

سرمایہ دارانہ نظام جس جمہوریت کو متعارف کروا کر تعلیم یافتہ سادہ لوح لوگوں کو آئین و قانون کا راگ الاپنے پر مجبور کرتا ہے وہ درحقیقت عالمی استحصالی نظام کی بنیادی اکائی ہے۔ اس نظامِ جمہوریت سے کسی بھی عام طبقہ کا بھلا نہیں ہو سکتا۔ اقبال بھی "خضر راہ" میں یہی کہتے ہیں۔ مارکسی نکتہ نظر کو سراہتی یہ نظم ایک خوبصورت لب و لہجے کے ساتھ بڑے سکون سے جمہوریت کے بخیے ادھیڑتی ہے۔

؎ دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری[16]

جمہوریت کے تحت سرمایہ دار گھوم پھر کر محنت کشوں کے دوبارہ سے آقا منتخب ہو جاتے ہیں کیونکہ مغرب کا جمہوری نظام اُسی قدیم ساز کہن کی گونج ہے۔ پھر یہی سرمایہ دار خوبصورت ایوانوں میں چیخ چیخ بندہ مزدور کے حقوق کی بحث کرتے ہیں تو "یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری" یہی سرمایہ دار پھر U.N. کی اعلیٰ نشستوں پر بیٹھ کر مذہب، نسل، رنگ، تہذیب بلکہ زبان کے تحت بھی ریاست بنانے کے قانون پاس کرتے ہیں تاکہ تقسیم کر کے حکومت کرنے اور پھر سرمایہ بٹورنے میں سہولت رہے۔ یوں ایک "عالمگیر سرمایہ داری نظام" ساری دنیا پر اپنے پنجے گاڑ لیتا ہے۔

؎ نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

پھر کہا:

؎ حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

"ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں اقبال جمہوری نظام کی اصلیت کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک جمہوری نظام پسندیدہ نہیں بلکہ رائج نظامات سے نسبتاً بہتر ہے۔ اقبال، مارکس کے معاشی نظام سے بھرپور متفق ہیں

---

[16] خضر راہ، بانگِ درا، کلیات اقبال، صفحہ 290/274

۔البتہ آپ کو "پرولتاریہ مساواتی ریاست" مذہب کی عدم موجودگی میں شتر بے مُہار نظر آتی ہے۔مارکس کا معاشی نظام آپ کو اسلامی نظام کے قریب قریب معلوم ہوتا ہے، مگر آپ لا کے بعد الا اللہ کے بھی قائل ہیں۔

لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

آپ کے مطابق علم و حکمت کے بکھرے موتی جہاں دستیاب ہیں ان سے دامن بھر لیا جائے اور اس سے اپنی قوم کی بہتری کی جائے۔

جس طرح انسان نے بہتے پانی کی موجوں سے کڑکتی بجلیوں سے اور مفکرین کے افکار سے فائدہ حاصل کر کے انسانی بہتری کا کام سرانجام دیا بالکل اسی طرح جہاں تک مارکس کا معاشی اور جدلیاتی نظام اسلام سے ٹکراتا نہیں وہاں تک اس سے استفادہ کیا جائے۔علامہ اقبال اوّل و آخر مذہب کی جائے امان میں فلاح ڈھونڈتے ہوئے کہتے ہیں ہ چاہیے جو نظام بھی تخلیق کر لو مگر جب تک انسان کی تربیت کر کے اس کو مفید نہ بناؤ گے تو وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم نہیں رُک سکے گی۔اسی لیے آپ لا کے بعد الا اللہ کے بھی قائل ہیں۔